اُصول ترجمہ وتفسیر

مولانا ابوالکلام آزادؒ

ہر عہد کا مصنف اپنے عہد کی ذہنی آب و ہوا کی پیداوار ہوتا ہے۔ اور اس قاعدے سے صرف وہی دماغ مستثنیٰ ہوتے ہیں جنہیں مجتہدانہ ذوق ونظر کی قدرتی بخشائش نے صفِ عام سے الگ کر دیا ہو چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں سے لے کر قرونِ اخیرہ تک جس قدر مفسر پیدا ہوئے ان کا طریقِ تفسیر ایک رو بہ تنزل معیارِ فکری مسلسل زنجیر ہے جس کی ہر پچھلی کڑی پہلی کڑی سے پست تر اور ہر سابق لاحق سے بلند تر واقع ہوئی ہے۔ اس سلسلے میں جس قدر اوپر کی طرف بڑھتے جاتے ہیں۔ حقیقت زیادہ واضح، زیادہ بلند اور اپنی قدرتی شکل میں نمایاں ہوتی جاتی ہے۔ جس قدر نیچے اترتے آتے ہیں حالت برعکس ہوتی جاتی ہے۔

یہ صورت حال فی الحقیقت مسلمانوں کے عام دماغی تنزل کا قدرتی نتیجہ تھی۔ انہوں نے جب دیکھا کہ قرآن کی بلندیوں کا ساتھ نہیں دے سکتے تو کوشش کی کہ قرآن کو اس کی بلندیوں سے اس قدر نیچے اتار لیں کہ ان کی پستیوں کا ساتھ دے سکے۔

اب اگر ہم چاہتے ہیں کہ قرآن کو اس کی حقیقی شکل و نوعیت میں دیکھیں تو ضروری ہے کہ پہلے وہ تمام پردے ہٹائیں جو مختلف عہدوں اور مختلف گوشوں کے خارجی موثرات نے اس کے چہرے پر ڈال دیے ہیں۔ پھر آگے بڑھیں اور قرآن کی حقیقت خود قرآن ہی کے صفحوں میں تلاش کریں۔

بعض اسباب وموثرات جو فہم حقیقت میں مانع ہیں

یہ مخالف اثرات جو یکے بعد دیگرے جمع ہوتے رہے دو چار نہیں بے شمار ہیں اور ہر گوشے میں پھیلے ہوئے ہیں ممکن نہیں کہ انحصار کے ساتھ بیان میں آسکیں۔ لیکن میں نے مقدمہ تفسیر میں کوشش کی ہے کہ انہیں چند اصول وانواع کے ماتحت سمیٹ لوں۔ اسی سلسلے میں حسب ذیل دفعات قابل غور ہیں۔

۱۔ قرآن حکیم اپنی وضع، اپنے اسلوب، اپنے اندازِ بیان، اپنے طریقِ خطاب، اپنے طریقِ استدلال،

غرضکہ اپنی ہر بات میں ہمارے وضعی اور صناعی طریقوں کا پابند نہیں ہے۔ اور نہ اسے پابند ہونا چاہیے۔ وہ اپنی ہر بات میں اپنا بے میل فطری طریقہ رکھتا ہے اور یہی وہ بنیادی امتیاز ہے جو انبیاء کرام علیہم السلام کے طریقِ ہدایت کو علم وحکمت کے وضعی طریقوں سے ممتاز کر دیتا ہے۔

قرآن جب نازل ہوا تو اس کے مخاطبوں کا پہلا گروہ بھی ایسا ہی تھا۔ تمدن کے وضعی اور صناعی سانچوں میں ابھی اس کا دماغ نہیں ڈھلا تھا۔ فطرت کی سیدھی سادی فکری حالت پر قانع تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن اپنی شکل ومعنی میں جیسا کہ واقع ہوا تھا ٹھیک ٹھاک ویسا ہی اس کے دلوں میں اتر گیا اور اسے قرآن کے فہم ومعرفت میں کسی طرح کی دشواری محسوس نہیں ہوئی۔ صحابہ کرام پہلی مرتبہ قرآن کی کوئی آیت یا سورت سنتے تھے اور سنتے ہی اس کی حقیقت پا لیتے تھے۔

لیکن صدر اول کا دور ابھی ختم نہ ہوا تھا کہ روم وایران کے تمدن کی ہوائیں چلنے لگیں اور پھر یونانی علوم کے تراجم نے علوم وفنون وضعیہ کا دور شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جوں جوں وضعیت کا شوق بڑھتا گیا قرآن کے فطری اسلوبوں سے طبیعتیں نا آشنا ہوتی گئیں۔ رفتہ رفتہ وہ وقت آ گیا کہ قرآن کی ہر بات وضعی اور صناعی طریقوں کے سانچوں میں ڈھالی جانے لگی۔ چونکہ ان سانچوں میں وہ ڈھل نہیں سکتی تھی۔ اس لیے طرح طرح کے الجھاؤ پیدا ہونے لگے اور پھر جس قدر کوششیں سلجھانے کی کی گئیں الجھاؤ اور زیادہ بڑھتے گئے۔

فطرت سے جب بعد ہو جاتا ہے اور وضعیت کا استغراق طاری ہو جاتا ہے تو طبیعتیں اس پر راضی نہیں ہوتیں کہ کسی بات کو اس کی قدرتی سادگی میں دیکھیں۔ وہ سادگی کے ساتھ حسن وعظمت کا تصور کر ہی نہیں سکتیں۔ وہ جب کسی بات کو بلند اور شاندار دکھانا چاہتی ہیں تو کوشش کرتی ہیں کہ زیادہ سے زیادہ وضعیت اور صناعیت کے پیچ وخم پیدا کر دیں۔ یہی معاملہ قرآن کے ساتھ پیش آیا ہے۔ سلف کی طبیعتیں وضعی طریقوں میں نہیں ڈھلی تھیں۔ اس لیے وہ قرآن کی سیدھی سادی حقیقت بے ساختہ پہچان لیتے تھے لیکن خلف کی طبیعتوں پر یہ بات شاق گزرنے لگی کہ قرآن اپنی سیدھی سادی شکل میں نمایاں ہو۔ ان کی وضعیت پسندی اس پر قانع نہیں ہو سکتی تھی۔ انہوں نے قرآن کی ہر بات کے لیے وضعیت کے جامے تیار کرنے شروع کر دیئے اور چونکہ یہ جامہ اس پر راست نہیں آسکتا تھا۔ اس لیے بہ تکلف پہنانا چاہا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ حقیقت کی موزونیت باقی نہ رہی۔ ہر بات ناموزوں اور الجھی ہوئی بن کر رہ گئی۔

تفسیر قرآن کا پہلا دور وہ ہے جب علوم اسلامیہ کی تدوین وکتابت شروع نہیں ہوئی تھی۔ دوسرا دور تدوین وکتابت سے شروع ہوتا ہے۔ اور اپنے مختلف عہدوں اور طبقوں میں اترتا آتا ہے۔ ہم

محسوس کرتے ہیں کہ ابھی دوسرا دور شروع ہی ہوا تھا کہ یہ جامہ قرآن کے لیے بننا شروع ہو گیا۔ لیکن اس منتہائے بلوغ، فلسفہ وعلوم کی ترویج واشاعت کا آخری زمانہ ہے۔ یہی زمانہ ہے جب امام فخر الدین رازی نے تفسیر کبیر لکھی اور پوری کوشش کی کہ قرآن کا سراپا اس مصنوعی لباس وضعیت سے آراستہ ہو جائے۔ اگر امام رازی کی نظر اس حقیقت پر ہوتی تو ان کی پوری تفسیر نہیں تو دو تہائی حصہ یقیناً بے کار ہو جاتا۔ بہر حال یاد رہے وضعیت کے سانچے جتنے ٹوٹتے جائیں گے۔ قرآن کی حقیقت اُبھرتی آئے گی۔

قرآن کے اسلوب بیان کی نسبت لوگوں کو جس قدر مشکلیں پیش آئیں محض اس لیے کہ وضعیت کا استغراق ہوا اور فطریت کی معرفت باقی نہ رہی۔ قرآن کے مختلف حصوں اور آیتوں کے مناسبات وروابط کے سارے الجھاؤ صرف اس لیے ہیں کہ فطریت سے بعد ہو گیا اور وضعیت ہمارے اندر بسی ہوئی ہے ہم چاہتے ہیں قرآن کو بھی ایک ایسی مرتب کتاب کی شکل میں دیکھیں جیسی کتابیں ہم مرتب کرتے ہیں۔

قرآن کی زبان کی نسبت بحثوں کا جس قدر انبار لگا دیا گیا ہے وہ بھی محض اس لیے ہے کہ فطرت کے سمجھنے کی ہم میں استعداد باقی نہیں رہی۔ قرآن کی بلاغت کا مسئلہ ہمارے وجدان کے لیے اس قدر سہل مگر ہمارے دماغ کے لیے اس قدر دشوار کیوں ہو رہا ہے؟ صرف اسی لیے کہ وضعیت کا خود ساختہ ترازو ہمارے ہاتھ میں ہے ہم چاہتے ہیں اسی سے قرآن کی بلاغت بھی وزن کریں۔

قرآن کا طریق استدلال کیوں نمایاں نہیں ہوتا؟ اس کے تمام دلائل وبراہین جنہیں وہ "حجۃ بالغۃ" سے تعبیر کرتا ہے کیوں مستور ہو گئے ہیں؟ اسی لیے کہ وضعیت کے استغراق نے منطق کا سانچہ ہمیں دے دیا ہے ہم چاہتے ہیں قرآن کے دلائل وبراہین بھی اسی میں ڈھالیں۔ غرضکہ جس گوشے میں جاؤ گے یہی اصل سامنے پاؤ گے۔

۲۔ جب کسی کتاب کی نسبت یہ سوال پیدا ہو، اس کا مطلب کیا ہے؟ تو قدرتی طور پر ان لوگوں کے فہم کو ترجیح دی جائے گی جنہوں نے خود صاحب کتاب سے مطلب سمجھا ہو۔ قرآن تئیس برس کے اندر بتدریج نازل ہوا۔ وہ جس قدر نازل ہوتا تھا صحابہ کرام سنتے تھے نمازوں میں دہراتے تھے اور جو کچھ پوچھنا ہوتا تھا۔ خود پیغمبر اسلام ﷺ سے پوچھ لیتے تھے۔ ان میں بعض افراد خصوصیت کے ساتھ فہم قرآن میں ممتاز ہوئے اور خود پیغمبر اسلام ﷺ نے اس کی شہادت دی مذہبی خوش اعتقادی کی بناء پر نہیں بلکہ قدرتی طور پر ان کے فہم کو بعد کے لوگوں کے فہم پر ترجیح ہونی چاہیے۔ لیکن بدقسمتی سے ایسا نہیں سمجھا گیا۔ بعد کے لوگوں نے اپنے اپنے عہد کے فکری موثرات کے ماتحت نئی نئی کاوشیں شروع کر دیں۔ اور سلف کی صریح تفسیر کے

خلاف ہر گوشے میں قدم اٹھا دیئے۔ کہا گیا "سلف ایمان میں قوی ہیں لیکن علم میں خلف کا طریقہ قوی ہے"۔ حالانکہ خود سلف کا اپنی نسبت یہ اعلان تھا کہ "ابرھم قلوبا و اعمقھم علما۔ نتیجہ یہ نکلا کہ روز بروز حقیقت مستور ہوتی گئی اور اکثر گوشوں میں ایک صاف بات الجھتے الجھتے بالکل ناقابل حل بن گئی۔

آفت پر آفت یہ ہوئی کہ پہلے ایک کمزور پہلو اختیار کیا گیا۔ پھر بڑھتے بڑھتے دور تک نکل گئے۔ پھر جب مشکلوں سے دوچار ہوئے تو نئی نئی بحثوں اور کاوشوں کی عمارتیں اٹھانے لگے۔ متون، شرح، حواشی اور منہیات وتعلیقات کا طریقہ یہاں بھی چلا۔ اس نے اور زیادہ الجھاؤ میں الجھاؤ ڈالے، اور بعض صورتوں میں تو پردوں کی اتنی تہیں جمع ہو گئیں کہ ایک کے بعد ایک اٹھاتے چلے جاؤ۔ ظلمات بعضھا فوق بعض۔ کا عالم دکھائی دے گا۔

اس بات کا اندازہ کرنے کے لیے کہ قرآن کا کوئی ایک مقام لے لو پہلے اس کی تفسیر صحابہ وتابعین کی روایات میں ڈھونڈو پھر بعد کے مفسروں کی طرف رخ کرو اور دونوں کا مقابلہ کرو صاف نظر آجائے گا کہ صحابہ وسلف کی تفسیر میں بالکل واضح تھا۔ بعد کی بے محل دقیقہ سنجیوں نے اسے کچھ سے کچھ بنا دیا اور الجھاؤ پیدا ہو گئے۔

مثلاً سورۂ بقرہ کی ابتدائی آیتوں کی نسبت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ "الذین یومنون بالغیب و یقیمون الصلوۃ۔ الخ" سے مقصود عرب کے اہل ایمان ہیں اور" والذین یومنون بما انزل الیک۔ الخ" سے اہل کتاب۔ امام ابن جریر نے بھی یہی تفسیر اختیار کی لیکن بعد کے مفسر اس پر قانع نہیں ہوئے اور عجیب عجیب دور از کار بحثیں پیدا کر دیں نتیجہ یہ نکلا کہ پہلے" ھدی للمتقین "کے مطلب کی نشست بگڑی پھر قرآن نے تین گروہوں کی تقسیم کر کے جس بات پر زور دیا تھا اس کی ساری خوبی اور حقیقت گم ہو گئی۔

۳۔ مسلم اقوام کے قصص وروایات اول دن سے پھیلنا شروع ہو گئے تھے۔ ان میں اسرائیلیات (یعنی یہودیوں کے قصص وخرافات) کو ہمیشہ محققین نے پہچاننا چاہا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان عناصر کے بھی اثرات دور دور تک سرایت کر چکے تھے اور وہ برابر جسم تفسیر میں پیوست رہے۔

۴۔ ایک طرف تو صحابہ وسلف کی روایات سے تغافل ہوا۔ دوسری طرف روایات تفسیر کے غیر محتاط جامعوں نے الگ آفت بپا کر دی اور ہر تفسیر جس کا سر کسی نہ کسی تابعی سے ملا دیا گیا سلف کی تفسیر سمجھ لی گئی۔

۵۔ اس صورت حال کا سب سے زیادہ افسوس ناک نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن کا طریق استدلال دور از کار دقیقہ سنجیوں میں گم ہو گیا۔ یہ ظاہر ہے کہ اس کے تمام بیانات کا محور ومرکز اس کا طریق استدلال ہی ہے۔ اس

کے ارشادات و بصائر، اس کے قصص و امثال، اس کے مواعظ و حکم، اس کے مقاصد و مہمات سب اسی چیز سے کھلتے اور ابھرتے تھے۔ یہ ایک چیز کیا گم ہوئی گویا اس کا سب کچھ ہی گم ہو گیا۔

ہمیں ورق کہ سیہ گشتہ مدعا ایں جاست

انبیاء کرام کا طریق استدلال یہ نہیں ہوتا کہ منطقی طریقہ پر نظری مقدمات ترتیب دیں پھر ان کی بحثوں میں مخاطب کو الجھانا شروع کر دیں۔ وہ براہ راست تلقین و اذعان کا فطری طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ اسے ہر دماغ وجدانی طور پر پالیتا ہے، ہر دل قدرتی طور پر قبول کر لیتا ہے لیکن ہمارے مفسروں کو فلسفہ و منطق کے انہماک نے اس قابل ہی نہ رکھا کہ کسی حقیقت کو اس کی سیدھی سادی شکل میں دیکھیں اور قبول کر لیں۔

انہوں نے انبیاء کرام کے لیے بڑی فضیلت اس میں سمجھی کہ انہیں منطقی بنا دیں اور قرآن کی ساری عظمت اس میں نظر آئی کہ اس کی ہر بات ارسطو کی منطق کے سانچے میں ڈھلی ہوئی نکلے۔ اس سانچے میں وہ ڈھل نہیں سکتی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن کے دلائل و براہین کی ساری خوب روئی اور دلکشی طرح طرح کی بناوٹوں میں گم ہو گئی۔ حقیقت تو گم ہو ہی چکی تھی۔ لیکن وہ بات بھی نہ بنی جو لوگ بنانی چاہتے تھے۔ شکوک و ایرادات کے بے شمار دروازے کھل گئے ان کے کھولنے میں تو امام رازی کا ہاتھ بہت تیز نکلا لیکن بند کرنے میں تیزی نہ دکھا سکے۔

۶۔ یہ آفت صرف طریق استدلال ہی میں پیش نہیں آئی بلکہ تمام گوشوں میں پھیلی۔ منطق و فلسفہ کے مباحث نے طرح طرح کی نئی مصطلحات پیدا کر دی تھیں۔ عربی لغت کے الفاظ ان مصطلحہ معانی میں مستعمل ہونے لگے تھے۔ یہ ظاہر ہے کہ قرآن کا موضوع فلسفہ یونانی نہیں ہے اور نہ نزول قرآن کے وقت عربی زبان ان مصطلحات سے آشنا ہوئی تھی۔ پس جہاں کہیں قرآن میں وہ الفاظ آئے ہیں، ان کے معانی وہ نہیں ہو سکتے جو وضع مصطلحات کے بعد قرار پائے لیکن اب ان کے وہی مفہوم لیے جانے لگے اور اس کی بنا پر طرح طرح کی دور از کار بحثیں پیدا کر دی گئیں۔ چنانچہ خلود، احدیت، مشیت، تفضل، حجت، برہان، تاویل وغیرہا نے وہ معانی پیدا کر لیے، جن کا صدر اول میں کسی سامع قرآن کو وہم و گمان بھی نہ ہوا ہوگا۔

۷۔ اسی تخم کے یہ بھی برگ و بار ہیں کہ سمجھا گیا کہ قرآن کو وقت کی تحقیقات علمیہ کا ساتھ دینا چاہیے۔ چنانچہ کوشش کی گئی کہ نظام بطلیموسی اس پر چپکا یا جائے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح آج کل کے دانش

فروشوں کا طریق تفسیر یہ ہے کہ موجودہ علم ہیئت کے مسائل قرآن پر چپکائے جائیں۔

۸۔ ہر کتاب اور تعلیم کے کچھ مرکزی مقاصد ہوتے ہیں اور اس کی تمام تفصیلات انہی کے گرد گردش کرتی ہیں۔ جب تک مراکز سمجھ میں نہ آئیں، دائرہ کی کوئی بات سمجھ میں نہیں آسکتی۔ قرآن کا بھی یہی حال ہے اس کے بھی چند مرکزی مقاصد و مہمات ہیں اور جب تک وہ صحیح طور پر نہ سمجھ لیے جائیں اس کی کوئی بات صحیح طور پر سمجھی نہیں جا سکتی۔

متذکرہ صدر اسباب سے جب اس کے مرکزی مقاصد کی وضاحت باقی نہ رہی۔ تو قدرتی طور پر اس کا ہر گوشہ اس سے متاثر ہوا۔ اس کا کوئی بیان، کوئی تعلیم، کوئی استدلال، کوئی خطاب، کوئی اشارہ، کوئی اجمال ایسا نہ رہا جو اس تاثر سے محفوظ ہو۔ افسوس یہ ہے کہ اختصار کا تقاضا مثالیں پیش کرنے سے مانع ہے اور بغیر مثال کے حقیقت واضح نہیں ہو سکتی مثلاً آل عمران کی آیت " وما کان لنبی ان یغل (۱۶۱:۳) کی تفسیر نکال کر دیکھو کیا کیا دور از کار بحثیں نہیں کی گئیں؟ یہودیوں کے اس قول کی تفسیر میں کہ "ید اللہ مغلولۃ" (۶۴:۵) کن کن گوشوں میں نہیں نکل گئے اور کس طرح محل بیان اور سیاق و سباق کا صاف صاف مقتضا نظر انداز کر دیا گیا؟

۹۔ قرآن کے صحت فہم کے لیے عربی لغت و ادب کا صحیح ذوق شرط اول ہے لیکن مختلف اسباب سے جن کی تشریح محتاج تفصیل ہے یہ ذوق کمزور پڑتا گیا یہاں تک کہ وہ وقت آ گیا جب مطالب میں بے شمار الجھاؤ محض اس لیے پڑ گئے کہ عربیت کا ذوق سلیم باقی نہیں رہا اور جس زبان میں قرآن نازل ہوا تھا اس کے محاورات و مدلولات سے یک قلم بعد ہو گیا۔

۱۰۔ ہر عہد کا فکری اثر تمام علوم و فنون کی طرح تفسیر میں بھی کام کرتا رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تاریخ اسلام کا یہ پر فخر واقعہ ہمیشہ یادگار رہے گا کہ علماء حق نے وقت کے سیاسی اثرات کے سامنے کبھی ہتھیار نہیں ڈالے۔ اور کبھی یہ بات گوارا نہ کی کہ اسلام کے عقائد و مسائل ان سے اثر پذیر ہوں۔ لیکن وقت کی تاثیر صرف سیاست ہی کے دروازے سے نہیں آتی۔ اس کے نفسیاتی موثرات کے بے شمار دروازے ہیں اور جب کھل جاتے ہیں تو کسی کے بند کیے بند نہیں ہو سکتے۔ ان کے استیلاء سے عقائد و اعمال محفوظ نہیں رکھے جا سکتے تھے اور علماء حق نے محفوظ رکھے لیکن دماغ محفوظ نہیں رکھے جا سکتے تھے اور محفوظ نہیں رہے۔ یہاں ضرورت مثالوں کی ہے، لیکن اس کی مثالیں تفصیل طلب ہیں اختصار کا تقاضا اجازت نہیں دیتا۔

۱۱۔ چوتھی صدی ہجری کے بعد علوم اسلامیہ کی تاریخ کا مجتہدانہ دور ختم ہو گیا اور شواذ و نو کے علاوہ شاہراہ، تقلید کی شاہراہ ہو گئی اس داء عضال نے جسم تفسیر میں بھی پوری طرح سرایت کی۔ ہر شخص جو تفسیر کے لیے

قدم اٹھاتا تھا کسی پیش رو کو اپنے سامنے رکھ لیتا تھا اور پھر آنکھیں بند کر کے اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہتا۔ اگر تیسری صدی میں کسی مفسر سے کوئی غلطی ہو گئی ہے تو ضروری ہے کہ نویں صدی کی تفسیروں تک وہ برابر نقل در نقل ہوتی چلی آئے۔ کسی نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ چند لمحوں کے لیے تقلید سے الگ رہ کر تحقیق کرے کہ معاملہ کی اصلیت کیا ہے؟ رفتہ رفتہ تفسیر نویسی کی ہمتیں اس قدر پست ہو گئیں کہ متداول تفسیر پر حاشیہ چڑھا دینے سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ بیضاوی اور جلالین کے حاشیے دیکھو، ایک بنے ہوئے مکان کی لیپ پوت کرنے میں کس طرح قوت تصنیف رائیگاں گئی ہے؟

۱۲۔ زمانے کی بد ذوقی نے بھی ہر کج اندیشی کو سہارا دیا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرون اخیرہ میں درس وتداول کے لیے وہی تفسیریں مقبول ہوئیں جو قدماء کے محاسن سے یک قلم خالی تھیں۔ وقت کا یہ سوءِ انتخاب ہر علم وفن میں جاری رہا ہے۔ جو زمانہ جرجانی پر سکاکی کو اور سکاکی پر تفتازانی کو ترجیح دیتا تھا۔ یقیناً اس کے دربار سے بیضاوی وجلالین ہی کو حسن قبول کی سند مل سکتی تھی۔

۱۳۔ متداول تفسیریں اٹھا کر دیکھو جس مقام کی تفسیر میں متعدد اقوال موجود ہوں وہاں اکثر اسی قول کو ترجیح دیں گے جو سب سے زیادہ کمزور اور بے محل ہوگا جو اقوال کی نقول کریں گے۔ ان میں بہتر قول موجود ہوگا۔ لیکن اسے نظر انداز کر دیں گے۔

۱۴۔ اشکال وموانع کا بڑا دروازہ تفسیر بالرائے سے کھل گیا جس کے اندیشے سے صحابہ وسلف کی روحیں لرزتی رہتی تھیں۔

تفسیر بالرائے کا مطلب سمجھنے میں لوگوں کو لغزشیں ہوئی ہیں۔ تفسیر بالرائے کی ممانعت سے مقصود یہ نہ تھا کہ قرآن کے مطالب میں عقل وبصیرت سے کام نہ لیا جائے کیونکہ اگر یہ مطلب ہو تو پھر قرآن کا درس و مطالعہ ہی بے سود ہو جائے حالانکہ قرآن کا یہ حال ہے کہ اول سے لے کر آخر تک تعقل وتفکر کی دعوت ہے۔ اور ہر جگہ مطالبہ کرتا ہے کہ "افلا یتدبرون القرآن ام علی قلوب اقفالها" (۴۷:۲۴) دراصل تفسیر بالرائے میں "رائے" لغوی معنی میں نہیں ہے، بلکہ "رائے" مصطلحہ شارع اور اس سے مقصود ایسی تفسیر ہے جو اس لیے نہ کی جائے کہ خود قرآن کیا کہتا ہے بلکہ اس لیے کی جائے کہ ہماری کوئی ٹھہرائی ہوئی رائے کیا چاہتی ہے اور کس طرح قرآن کو کھینچ کر اس کے مطابق کر دیا جا سکتا ہے۔

مثلاً جب باب عقائد میں رد و کد شروع ہوئی تو مختلف مذاہب پیدا ہو گئے۔ ہر مذہب کے مناظر نے یہ چاہا، اپنے مذہب پر نصوص قرآنیہ کو ڈھالے وہ اس کی جستجو میں نہ تھے کہ قرآن کیا کہتا ہے؟ بلکہ ساری کاوش اس کی تھی کہ کسی طرح اسے اپنے مذہب کی مؤید دکھلا دیں۔ اسی طرح کی تفسیر بالرائے

تھی۔

یا مثلاً مذہب فقہیہ کے مقلدوں میں جب تحزب وتشیع کے جذبات تیز ہوئے تو اپنے مسائل کی بیچ میں آیات قرآنیہ کو کھینچنے تاننے لگے۔ اس کی کچھ فکر نہ تھی کہ لغت عربی کے صاف صاف معانی، اسلوب بیان کا قدرتی مقتضیٰ عقل وبصیرت کا واضح فیصلہ کیا کہتا ہے؟ تمام تر کوشش یہی تھی کہ کسی نہ کسی طرح قرآن کو اپنے امام کے مذہب کے مطابق کر دکھائے۔ یہ طریق تفسیر بالرائے ہے۔

یا مثلاً صوفیہ کا ایک گروہ اسرار وبطون کی جستجو میں دور تک نکل گیا اور پھر اپنے موضوعہ عقائد ومباحث پر قرآن کو ڈھالنے لگا۔ قرآن کا کوئی حکم، کوئی عقیدہ، کوئی بیان تحریف معنوی سے نہ بچا، یہ تفسیر تفسیر بالرائے تھی۔

یا مثلاً قرآن کے طریق استدلال کو منطقی جامہ پہنانا یا جہاں کہیں آسمان اور کواکب ونجوم کے الفاظ آ گئے ہیں یونانی علم ہیئت کے مسائل چپکانے لگا۔ یقیناً تفسیر بالرائے ہے۔

یا مثلاً آج کل ہندوستان اور مصر کے بعض مدعیان اجتہاد ونظر نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ زمانہ حال کے اصول علم وترقی قرآن سے ثابت کیے جائیں۔ یا جدید تحقیقات علمیہ کا اس سے استنباط کیا جائے، گویا قرآن صرف اسی لیے نازل ہوا کہ جس بات کو کوپرنیکس (Copemicus) اور نیوٹن (Newton) نے یا ڈارون (Darwin) اور ویلس (Wallace) نے بغیر کسی الہامی کتاب کے فلسفہ اندیشیوں کے دریافت کر لی۔ اسے چند صدی پہلے معموں کی طرح دنیا کے کان میں پھونک دے اور پھر وہ بھی صدیوں تک دنیا کی سمجھ میں نہ آئیں، یہاں تک کہ موجودہ زمانہ کے مفسر پیدا ہوں اور تیرہ سو سال پیشتر معمے حل فرمائیں۔ یقیناً یہ طریق تفسیر بھی ٹھیک ٹھیک تفسیر بالرائے ہے۔

جستجوئے حقیقت

یہ چند اشارات ہیں کہ اختصار کے تقاضے اور محل کی تنگنائی پر بھی حوالہ قلم ہوئے، ورنہ شرح اس معاملے کی بہت طولانی ہے۔ تو خود حدیث مفصل بخواں ازیں مجمل۔ کم از کم ان مجمل اشارات سے اس بات کا اندازہ کر لیا جا سکتا ہے کہ راہ کی مشکلات وموانع کا کیا حال ہے اور کس طرح قدم قدم پر پردوں کو ہٹانا، اور چپہ چپہ پر رکاوٹوں سے دوچار ہوتا ہے۔ پھر رکاوٹیں کسی ایک گوشے ہی میں نہیں ہیں اور مشکلات کسی ایک دروازے ہی سے نہیں آتی ہیں۔ بیک وقت ہر وادی کی پیمائش اور ہر گوشے میں نظر و کاوش ہونی چاہیے۔ تب کہیں جا کر حقیقت گم گشتہ کا سراغ مل سکتا ہے۔

دعوت فکر و نظر

کیا مسیار میرج جائز ہے؟

ڈاکٹر محمد شکیل اوج

مرد و عورت کے مابین ازدواجی رشتہ بذریعہ نکاح قائم ہوتا ہے جو اپنے قیام میں ہر دو فریق کی باہمی رضامندی کا متقاضی ہوتا ہے اس رضامندی کو اصطلاح شریعت میں ایجاب و قبول کہتے ہیں۔ بالعموم یہ نکاح بغیر کسی شرط کے وقوع پذیر ہوتا ہے اور گاہے لڑکی والوں کی طرف سے کوئی شرط بھی عائد کر دی جاتی ہے۔ مثلاً منکوحہ کو ماہانہ آتی رقم بطور جیب خرچ کے لازماً دینی ہوگی وغیرہ وغیرہ واضح رہے کہ اسطرح کی شرطیں عام طور پر لڑکی کے تحفظ (Protection) کے لئے عائد کی جاتی ہیں۔

نکاحوں میں شرطوں کا حوالہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نکاح سے دیا جاتا ہے کہ جس میں انہیں آٹھ یا پھر دس سال اپنے سسر کے ہاں ملازمت اختیار کرنے کا پابند کیا گیا تھا۔ اور ان دونوں مدتوں میں سے پہلی مدت لازمی اور دوسری اختیاری تھی۔

قال انی ارید ان انکحک احدی ابنتی ھتین علی ان تاجرنی ثمنی حجج فان اتممت عشرا فمن عندک۔ (قصص ۲۷)

(لڑکی کے باپ نے موسیٰ سے) کہا میں چاہتا ہوں کہ اپنی ان دونوں بیٹیوں میں سے کسی ایک کا نکاح تم سے کر دوں، اس شرط پر کہ تم آٹھ سال تک میری ملازمت میں رہو اور اگر دس سال پورے کر دو تو یہ تمہاری طرف سے احسان ہوگا۔

آیت میں تاجرنی کے لفظ پر نظر رہے۔ تاجرنی کا مطلب ہے تم میری ملازمت کرو (یعنی لڑکی کے باپ کی) اگر لڑکی کی ملازمت مطلوب ہوتی تو تاجرنی کے بجائے تاجرھا ہوتا اور یوں اسے مہر کا بدل قرار دینا بھی ممکن ہوتا۔

سیاق عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ آٹھ سال کی مزدوری کو نکاح کی شرط بنایا گیا ہے نہ کہ مہر کو۔ کیونکہ ارادۂ نکاح سے پہلے ہی موسیٰ علیہ السلام کو اجرت پر رکھنے کا مشورہ خود لڑکی نے دیا تھا (آیت ۲۶) آیت نمبر ۲۵ میں بھی اجر کا لفظ آیا ہے جو مویشیوں کو پانی پلانے کی جزاء کے مفہوم پر مشتمل ہے اور آیت نمبر ۲۶ میں استاجرہ۔ اور من استاجرت کے الفاظ صراحت کے ساتھ اجارہ کے مفہوم پر دلالت کرتے ہیں۔ اجارہ دراصل اجرت دے کر کام کرانے کو کہتے ہیں۔ جو مہر کا بدل نہیں ہوتا۔ اور ویسے بھی نکاح کی بات آیت نمبر ۲۷ میں آتی ہے اس لیے ان تاجرنی کا مطلب، نکاح کے لئے اجارہ بطور شرط کے بنتا ہے نہ کہ بطور مہر کے۔

بہرحال آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ انعقاد نکاح کے لئے شرعی اعتبار سے کسی بھی جائز شرط کو موقع و محل کی مناسبت سے اختیار کیا جا سکتا ہے۔

مگر زمانے کی تیزی سے بدلتی ہوئی اقدار نے مذہب و اخلاق کی دنیا پر بھی اپنا اثر ڈالا ہے۔ ہمیشہ سے رشتۂ ازدواج میں مرد کی فعالیت اور عورت کی انفعالیت اہم اور بنیادی عامل کا کردار ادا کرتے رہے ہیں اور اس فرق و امتیاز کی بنیاد پر نظام کار وضع کیا جاتا رہا ہے۔ پھر اسی تفریق پر اصلاً مرد کا میدان بیرون خانہ اور عورت کا درون خانہ مقرر ہوا ہے۔ شوہر کو کفیل و نگران ہونے کی بناء پر ایک گونہ فضیلت کا درجہ بھی حاصل رہا ہے۔ مگر فی زمانہ یورپین اسٹائل آف لائف نے مسلمان معاشروں کے اندر وہ تمام قدریں بری طرح جھنجھوڑ ڈالی ہیں جنہوں نے صدیوں نہیں ہزاروں برس دنیا پر حکمرانی کی ہے۔ اور جو کہ بیش تمام مذاہب و اقوام کا مشترک سرمایہ ہی ہیں۔

نکاح کے تعلق سے اب ایک نئی اصطلاح متعارف ہوئی ہے۔ جسے مسیار کا نام دیا جاتا ہے۔ اس نکاح میں مرد و عورت بالکل عام طریقے سے رشتۂ ازدواج میں بندھتے ہیں مگر اس میں مرد کا کردار عورت کے حق میں غیر کفالتی ہوتا ہے یعنی وہ بیوی کی طرف سے کسی بھی معاشی ذمہ داری سے دور رکھا جاتا ہے اور یہ بات بوقت نکاح یا قبل از نکاح مرد کے ساتھ طے کر لیجاتی ہے۔

کہاں وہ پرانی قدر کہ جسمیں مرد کو کفالت کے بندھن میں کس کر جکڑ دیا جاتا تھا اور کہاں یہ پیش آمدہ صورت حال کہ جسمیں مرد کو اس اہم ذمہ داری سے سبکدوش کر دیا گیا ہے۔ یقیناً اس بدلتی ہوئی قدر کے متعدد اسباب ہو سکتے ہیں۔ جنکی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔ ہم نے تو یہاں مسیار کے جواز و عدم جواز کے باب میں اپنا دو ٹوک نقطہ نظر بیان کرنا ہے جو خالصتاً شرعی نوعیت کا ہے۔

انعقاد نکاح کی تمام صورتیں مسیار میں اگر پائی جاتی ہوں تو ہم اسے نکاح صحیح قرار دینے پر مجبور ہیں۔ فقہائے نکاح کی شرائط کو تین انواع میں تقسیم کیا ہے۔

ا۔ شرائط انعقاد نکاح

۲۔ شرائط جواز نکاح

۳۔ شرائط لزوم نکاح

انعقاد نکاح کی پہلی شرط عقل، دوسری بلوغ اور تیسری رضامندی ہے۔

یہ وہ شرائط ہیں جنکا تعلق عاقدین نکاح سے ہے جبکہ چوتھی شرط اتحاد مجلس اور پانچویں مجلس عقد میں گواہوں کی موجودگی ہے۔ یہ وہ شرائط ہیں کہ جنکا تعلق مجلس عقد سے ہے۔ (جواز نکاح اور لزوم نکاح کا موضوع زیر بحث سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس لیئے اس سے صرف نظر کیا گیا ہے)

مرد کے ذمہ نکاح کے تعلق سے دو اہم فرائض عائد ہوتے ہیں (۱) مہر کی ادائیگی، (۲) نان و نفقہ کی ادائیگی۔ مگر عورت کو اختیار ہے کہ وہ اپنے مہر کو بالکلیہ یا اسمیں سے کچھ حصہ واپس کردے یا ادائیگی سے قبل ہی اسے جزءو یا کلیۃً معاف کردے۔ اسطرح اگر کوئی عورت بسبب اچھی ملازمت یا اپنی مالداری کے اپنے شوہر کو ادائی نفقہ سے آزاد کردے تو اس سے نفس نکاح میں کسی قسم کا کوئی فساد واقع نہیں ہوتا۔ کیا ہمارے معاشرے میں ایسی مثالیں موجود نہیں ہیں کہ بیویاں کمارہی ہیں اور شوہروں کے پاس نہ کوئی ملازمت ہے اور نہ ہی کاروبار۔ اس لیئے مجبوراً حالات سے سمجھوتہ کرتے ہوئے انہوں نے گھریلو ذمہ داریاں اپنے سر لے لی ہیں۔ پھر کسی شرط کے عائد کرنے کا کسی قدر غالب (شرط) کے فقدان سے اسکی شرعی حیثیت بہر حال مجروح نہیں ہوجاتی۔ تاہم عام حالات میں ایسے نکاح کو پسندیدہ اور مستحسن بھی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ ہاں کسی خاص صورت حال میں اسطرح کے نکاح یقیناً مفید بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔ اور معاشرے میں زنا کو روکنے کا ذریعہ بھی۔ اس لیئے اصلاً اسے جواز کی نظر سے دیکھنا چاہیے۔

مسیار کی ایک دوسری شکل یہ بھی ہے کہ مرد بہت مالدار ہو اور عورت، غریب ایسا مرد جب کسی عورت سے نکاح کرتا ہے تو اسے مہر میں گراں قدر رقم کے ساتھ ساتھ تحفے تحائف بھی دیتا ہے۔ اکثر و بیشتر جائیداد بھی، پھر کچھ عرصے بعد اسے طلاق دے کر چلا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مسیار میں طلاق بطور شرط کے نہیں ہوتی۔ ہاں بالعموم ایسا ضرور ہوتا ہے کہ نکاح کرنے والا کچھ عرصہ کے بعد اسے چھوڑ جاتا ہے مگر وہ اسے محتاجگی کی حالت میں نہیں چھوڑتا بلکہ اکثر عورت کو اسکی حیثیت سے بڑھ کر مال و متاع دیکر جاتا ہے مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ ۱۹ جولائی ۲۰۰۶ء کے حوالے سے انٹرنیٹ سے جاری ہونے والی ایک رپورٹ کے مطابق ۷۰ فیصد مسیار شادیاں، طلاق سے محفوظ قرار دی گئی ہیں۔ مسیار شادیوں میں گو وہ کتنے ہی محدود مدت پر کیوں نہ ختم ہوگئی ہوں اگر اسمیں ثبوت نسب اور ایک دوسرے کی زوجیت میں مرنے کی صورت میں حصول وراثت سے انکار نہ پایا جاتا ہو۔ تو اسے صراحتاً جائز قرار دیا جائے گا۔

روایت تلک غرانیق العلی کی تحقیق

علامہ غلام رسول سعیدی
سابق رکن اسلامی نظریاتی کونسل، حکومت پاکستان
شیخ الحدیث والتفسیر دار العلوم نعیمیہ، کراچی

وما ارسلنا من قبلک من رسول ولا نبی الا اذا تمنی القی الشیطن فی امنیته فینسخ الله مایلقی الشیطن ثم یحکم الله ایته والله علیم حکیم۔ (الحج/۵۲)

اور ہم نے آپ سے پہلے جو بھی رسول اور نبی بھیجا تو جب بھی اس نے (اپنی امت کو وسعت کی) تمنا کی تو شیطان نے (لوگوں کے دلوں میں شبہات ڈال کر) اسکی تمنا (پوری ہونے) میں رخنہ ڈال دیا۔ سو اللہ شیطان کے ڈالے ہوئے (شبہات) کو زائل کر دیتا ہے۔ پھر اللہ اپنی آیات کو پختہ کر دیتا ہے اور اللہ خوب جاننے والا، بہت حکمت والا ہے۔

الحج: ۵۲ کے چند مشہور تراجم

شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی متوفی ۶۹۱ھ لکھتے ہیں:

ونفرستادیم پیش از تو ہیچ رسولے ونہ خبر دہندہ از خدا مگر چوں تلاوت کرد بیفگند شیطان در تلاوت او آنچہ خواست پس باطل گرداند خدائے آنچہ در افگندہ باشد شیطان پس ثابت کند خدائے آیت ہائے خود را۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی متوفی ۱۱۷۶ھ لکھتے ہیں:

ونفرستادیم پیش از تو ہیچ فرستادہ ونہ ہیچ صاحب وحی الا چوں آرزوے بخاطر بست با فگند شیطان چیزے در آرزوے وے پس دور مے کند خدا آنچہ شیطان انداختہ است باز محکم مے کند خدا آیات

خوردا۔

شاہ رفیع الدین متوفی ۱۲۳۳ھ لکھتے ہیں:

اور نہیں بھیجا ہم نے پہلے تجھ سے کوئی رسول اور نہ نبی مگر جس وقت آرزو کرتا تھا ڈال دیتا تھا شیطان بیچ آرزو اس کے کے، پس موقوف کر دیتا ہے اللہ، جو ڈالتا ہے شیطان پھر محکم کرتا ہے اللہ نشانیوں اپنی کو۔

شاہ عبدالقادر محدث دہلوی متوفی ۱۲۳۰ھ لکھتے ہیں:

اور جو رسول بھیجا ہم نے تجھ سے پہلے یا نبی سو جب خیال باندھنے (لگا) شیطان نے ملا دیا اس کے خیال میں، پھر اللہ مٹاتا ہے شیطان کا ملایا پھر پکی کرتا ہے اپنی باتیں۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان بریلوی متوفی ۱۳۴۰ھ لکھتے ہیں:

اور ہم نے تم سے پہلے جتنے رسول یا نبی بھیجے سب پر کبھی یہ واقعہ گزرا ہے کہ جب انہوں نے پڑھا تو شیطان نے ان کے پڑھنے میں لوگوں پر کچھ اپنی طرف سے ملا دیا تو مٹا دیتا ہے اللہ تعالیٰ اس شیطان کے ڈالے ہوئے کو پھر اللہ اپنی آیتیں پکی کر دیتا ہے۔

حضرت سید محمد محدث پچھوچھوی متوفی (۱۹۶۱ء) لکھتے ہیں:

اور نہیں بھیجا ہم نے تم سے پہلے کوئی رسول نہ نبی مگر یہ کہ جب پڑھا تو شیطان نے اپنی طرف سے اپنوں کے لیے بڑھا دیا ان کے پڑھنے میں تو میٹ دیتا ہے اللہ جو شیطان کا القاء ہے پھر مضبوط فرما دیتا ہے اللہ اپنی آیتوں کو۔

حضرت سید احمد سعید کاظمی متوفی ۱۴۰۶ھ لکھتے ہیں:

اور ہم نے (غیب کی خبریں دینے والا اپنا مبعوث) کوئی رسول اور نبی آپ سے پہلے نہیں بھیجا مگر اس نے تلاوت کی تو شیطان نے اس کی تلاوت کے دوران (لوگوں پر اپنی طرف سے) ڈال دیا تو اللہ مٹا دیتا ہے شیطان کے ڈالے ہوئے کو اور پھر اپنی آیتیں خوب پکی کر دیتا ہے۔

شاہ ولی اللہ، شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر نے اس آیت میں تمنی کا معنی آرزو کیا ہے۔ شیخ تھانوی اور سید مودودی نے بھی یہی معنی کیا ہے اور باقی مترجمین نے تمنی کا معنی پڑھا یا تلاوت کیا، کیا ہے اور مؤخر الذکر معنی ایک روایت پر مبنی ہے جو شدید ترین ضعیف ہے اور بعض نے اس کو موضوع کہا ہے اور تمام محققین علماء، مفسرین اور محدثین نے تمنی کا معنی آرزو ہی کیا ہے۔ پہلے ہم اس شدید ضعیف روایت کا ذکر کریں گے جس کو اس آیت کے شان نزول میں بیان کیا جاتا ہے پھر اس روایت کا شدید ضعف بیان

کریں گے پھر اس سلسلہ میں مفسرین اور محدثین کی نقول اور تصریحات پیش کریں گے فنقول وباللہ التوفیق وبہ الاستعانۃ یلیق۔

الحج: ۵۲ کا شان نزول

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں ذکر ہے کہ جب حضور اکرم ﷺ نے سورۃ النجم پڑھی تو آپ نے سجدہ کیا اور سب مسلمانوں اور مشرکوں نے بھی سجدہ کیا۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۱۰۷۱) مشرکوں نے جو سجدہ کیا اس کی صحیح وجہ یہ ہے کہ آپ نے یہ آیات تلاوت فرمائیں:

افرایتم اللات والعزی و منوۃ الثالثۃ الاخری۔ (النجم: ۱۹)

کیا تم نے دیکھا لات اور عزیٰ کو اور اس تیسری مناۃ کو۔

تو مشرکین اس بات سے خوش ہوئے کہ قرآن کریم میں ان کے بتوں کا ذکر آ گیا اور انہوں نے بھی سجدہ کر لیا۔ اس سلسلہ میں مسند بزار اور تفسیر ابن مردویہ میں ایک شدید ضعیف روایت ذکر کی گئی ہے۔ جس میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے جب ومنوۃ الثالثۃ الاخری کی تلاوت کی تو شیطان نے آپ کی تلاوت میں خود یہ الفاظ ملا دیے یا آپ کی زبان سے جاری کرا دیے۔

تلک الغرانیق العلی فان شفاعتھن ترتجی۔

یہ مرغان بلند بانگ ان کی شفاعت کی مقبولیت متوقع ہے۔

یہ سن کر مشرکین خوش ہوئے اور سجدہ کر لیا۔ بعد میں جبرائیل نے آ کر عرض کیا آپ نے وہ چیز تلاوت کی جس کو میں لے کر آیا نہ اللہ تعالیٰ نے اس کو نازل کیا اور آپ کے استفسار پر بتلایا کہ آپ نے یہ کلمات پڑھے۔ آپ رنجیدہ ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی تسلی کے لیے یہ آیات نازل فرمائیں:

وما ارسلنا من قبلک من رسول ولا نبی الا اذا تمنی القی الشیطان فی امنیتہ فینسخ اللہ ما یلقی الشیطان ثم یحکم اللہ ایتہ۔ (الحج: ۵۲)

اللہ تعالیٰ نے آپ سے پہلے کوئی رسول اور نبی نہیں بھیجا مگر (اس کے ساتھ یہ واقعہ گزرا ہے) جب اس نے آیات کی تلاوت کی تو شیطان نے اس کی تلاوت میں اپنی طرف سے کچھ ملا دیا پس اللہ تعالیٰ نے شیطان کے ملائے کو منسوخ کر دیا اور اپنی آیات کو محکم کر دیا۔

یہ روایت اپنی تمام اسانید کے ساتھ سنداً باطل اور عقلاً مردود ہے، کیونکہ نہ یہ ممکن ہے کہ شیطان آپ کی زبان سے کلام کرے اور نہ یہ کہ اپنی آواز کو آپ کے مشابہ کر سکے اور سننے والے اس کی آواز آپ کی آواز قرار دیں اگر بالفرض ممکن ہو تو تمام شریعت سے اعتماد اٹھ جائے گا کیونکہ ہو سکتا ہے کہ ہم

تک صحابہ کی روایت سے جو احکام پہنچے ہیں وہ آپ کا فرمان نہ ہو بلکہ شیطان کا کہا ہوا ہو۔ نیز حدیث صحیح سے ثابت ہے کہ شیطان خواب میں آ کر حضور ﷺ کی مثل نہیں بن سکتا تو جب شیطان آپ کی صورت کے مماثل نہیں ہو سکتا تو آواز کے مماثل کیسے ہو سکتا ہے اور جب وہ سونے والے پر اشتباہ نہیں ڈال سکتا حالانکہ وہ اس حال میں مکلف نہیں ہوتا تو بیدار پر کیسے اشتباہ ڈال سکتا ہے جبکہ وہ مکلف ہوتا ہے امام ابو منصور ماتریدی، امام بیہقی، امام رازی، قاضی بیضاوی، علامہ نووی، علامہ کرمانی، علامہ بدر الدین عینی، علامہ قسطلانی اور علامہ آلوسی اور دیگر تمام محققین نے ان روایات کو رد کر دیا ہے۔ اہل علم میں سوا علامہ عسقلانی اور علامہ کورانی کے کسی نے ان روایات پر اعتماد نہیں کیا۔ سورۂ حج کی اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے علامہ آلوسی نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ جب اپنی تبلیغ کے پیش نظر امت میں وسعت کی تمنا کرتے تو شیطان مسلمانوں کو دین سے برگشتہ کرنے کے لئے ان کے دلوں میں اسلام کے خلاف شکوک ڈال دیتا۔ مثلاً شجرۃ الزقوم کے بارے میں کہتا جہنم میں درخت کا کیا معنی؟ درخت تو لکڑی کا ہوتا ہے اور آگ لکڑی کو جلا دیتی ہے پھر جہنم میں درخت کیسے ہو سکتا ہے۔ قرآن میں مکھی کا ذکر آیا تو کہا اتنا بڑا خدا ہے اور اتنی حقیر چیز کی مثال دیتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے:

انکم وما تعبدون من دون الله حصب جهنم۔ (الانبیاء: ۹۸)

تم اور اللہ کے سوا تمہارے معبود سب جہنم کا ایندھن ہیں۔

تو کہا عیسیٰ اور عزیر علیہما السلام کی بھی عبادت کی گئی ہے اگر وہ بھی جہنم میں گئے تو ہمارے بت بھی چلے جائیں تو کوئی حرج نہیں۔ قرآن کریم میں ہے:

ولا تاکلوا مما لم یذکر اسم الله علیه۔ (الانعام: ۱۲۱)

جس پر خدا کا نام نہ لیا جائے اسے مت کھاؤ۔

تو کہا کمال ہے خدا کا مارا ہوا حرام ہو اور تمہارا مارا ہوا حلال ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی زبان سے ان تمام شبہات کو زائل کر کے اپنے دین اور اپنی آیات کو محکم فرما دیا۔ اس تفسیر کی بنیاد اس بات پر ہے کہ تمنی کا معنی "پڑھا" نہیں بلکہ "آرزو کی" ہے۔ اور اب آیت کا ترجمہ یوں ہوگا۔

"ہم نے آپ سے پہلے کسی رسول اور نبی کو نہیں بھیجا مگر جب بھی اس نے (اپنی امت کی وسعت کی) تمنا کی تو شیطان نے اس کی تمنا میں (لوگوں کے دلوں میں شبہات پیدا کر کے) خلل ڈال دیا تو اللہ تعالیٰ شیطان کے وسوسہ کو مٹا دیتا ہے اور اپنی آیات کو محکم کر دیتا ہے"۔ (روح المعانی جز ۱۷ ص ۲۵۷)

روایت تلک الغرانیق کا متن

امام بزار بیان کرتے ہیں:

امام بزار اپنی سند میں یوسف بن حماد، امیہ بن خالد، شعبہ، ابو بشر، سعید بن جبیر کے ساتھ حضرت ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ مکہ میں تھے آپ نے سورۃ النجم پڑھی جب اس آیت پر پہنچے" افرایتم اللات والعزی ومنوۃ الثالثۃ الاخری "تو نبی ﷺ کی زبان پر یہ کلمات جاری ہوئے۔" تلک الغرانیق العلی فان الشفاعۃ منهم ترتجی "یہ مرغان بلند بانگ ان کی شفاعت متوقع ہے۔ حضرت ابن عباس کہتے ہیں کہ مشرکین یہ سن کر خوش اور رسول اللہ ﷺ رنجیدہ ہوئے۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: (ترجمہ) ہم نے آپ سے پہلے جب بھی کوئی نبی یا رسول بھیجا تو اس کے ساتھ یہ ہوا ہے کہ جب اس نے تلاوت کی تو شیطان اس کی تلاوت میں کچھ القاء کر دیتا ہے پھر اللہ تعالیٰ شیطان کے القاء کو مٹا دیتا ہے اور اپنی آیات پختہ کر دیتا ہے۔

اس روایت کو بیان کرنے کے بعد امام بزار لکھتے ہیں:

کہ ہمارے علم میں اس سند کے سوا اس حدیث کی اور کوئی ایسی سند متصل نہیں ہے جس کا ذکر کرنا جائز ہو۔ امیہ بن خالد مشہور ثقہ ہے یہ حدیث کلبی از ابو صالح از ابن عباس کی سند کے ساتھ معروف ہے۔ (کشف الاستار ج ۳ ص ۷۲)

علامہ الہیثمی اس روایت کو امام طبرانی اور امام بزار کے حوالے سے ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

امام طبرانی نے فرمایا: میں اس حدیث کو صرف حضرت ابن عباس کی روایت سے جانتا ہوں۔ سورۂ حج کی تفسیر میں اس سے طویل حدیث گزر چکی ہے لیکن وہ ضعیف الاسناد ہے۔ (مجمع الزوائد ج ۷ ص ۱۱۵ مطبوعہ دار الکتاب العربی، بیروت ۱۴۰۲ھ)

علامہ الہیثمی نے امام طبرانی کی اس دوسری روایت کو عروہ بن الزبیر سے روایت کیا ہے اور یہ روایت مرسل ہے کیونکہ عروہ بن الزبیر تابعی ہیں، انہوں نے زمانہ رسالت کو نہیں پایا تھا۔ اس کا ذکر مجمع الزوائد ج ۷ ص ۷۲۔ ۷۱ میں ہے اور ہم نے اس کو تفصیل کے ساتھ شرح صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۵۸۔ ۱۵۷ میں بیان کیا ہے۔